کتاب : اسلام میں تصورِ جہاد اور دورِ حاضر میں عملِ جہاد

مؤلف : حافظ مبشر حسین لاہوری

ناشر : مبشر اکیڈمی، مکان نمبر۱۱، گلی نمبر۲۱، نزد مکہ مسجد، مکھن پورہ، نیو شادباغ-لاہور

سالِ اشاعت : ۲۰۰۳ء

صفحات : ۴۷۷

قیمت : مجلد، ۱۶۰ روپے

تبصرہ نگار : سفیر اختر☆

دہشت گردی کے خلاف جاری جنگ کے تناظر میں دُنیا بھر میں اور بالخصوص وطنِ عزیز میں جو مباحثہ جاری ہے، اس میں اسلام کے تصورِ جہاد، کشمیر و فلسطین اور چیچنیا جیسے مقبوضہ علاقوں کے حریت پسند مسلمانوں کی مسلح جدوجہد، جہاد اور دہشت گردی کے درمیان فرق، دہشت گردی کے اسباب و عوامل، اس میں دینی تعلیم اور مدارس کے مبینہ و موہومہ کردار، حریت پسند مسلمانوں کے خلاف ریاستی مظالم، عالمی طاقتوں کے دہرے معیاروں اور اُمتِ مسلمہ کے لائحۂ عمل کے بارے میں مختلف نقطہ ہائے نظر کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس جاری مباحثے میں حافظ مبشر حسین لاہوری نہایت بلند آہنگی سے شریک ہوئے ہیں اور اسلام کے تصورِ جہاد کے حوالے سے انہوں نے جن مسائل کو اپنے غور و فکر کا موضوع بنایا ہے، ان میں سے چند ایک یہ ہیں: ''دورِ حاضر میں جہاد کے لیے کون کون سے مراحل طے کرنا ناگزیر ہے؟ مقبوضات کی آزادی کے لیے ہمارا لائحۂ عمل کیا ہو؟ آزاد مسلم ممالک میں ہونے والی اسلام کش پالیسیوں کے بالمقابل ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اپنے ملکوں، شہروں اور گھروں میں گھس بیٹھئے مغربی تمدن کے ساتھ ہمارا برتاؤ کیسا ہو؟ اُمت مسلمہ کی داخلی کشمکش اور باہمی ناچاقی کا انسداد کیسے کیا جائے؟ عالم اسلام کی مجموعی تعمیر و ترقی اور ملت اسلامیہ کے عروج کے لیے ہمارا مشترکہ پروگرام کیا ہو؟''(ص۲۲)۔

ان مسائل پر غور و فکر کرتے ہوئے اُن کی تحریر نے ان کے بقول ''کئی کتابوں'' کی شکل اختیار

☆ چیف ایڈیٹر، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

کر لی ہے جن میں سے ایک پیش نظر ہے۔ اس میں حافظ صاحب نے ''جہادی تحریکوں میں شامل'' رہ کر رازہائے درونِ خانہ سے آگاہ شخص (in sider) کی حیثیت سے ''ان جذباتی نوجوانوں'' کو رہنمائی فراہم کرنے کی کوشش کی ہے جو اُن کے بقول ''عالمی حقائق سے ناواقف، [مگر] سردھڑ کی بازی لگا دینے کا عزمِ صمیم رکھنے والے'' ہیں۔ حافظ صاحب کے نزدیک ''یہ حقیقت ہے کہ اس وقت دُنیا بھر میں جاری جہادی تحریکوں اور بالخصوص پاکستان کی جہادی تحریکوں میں شامل لوگوں کی اکثریت اوّل تو ناپختہ نوجوانوں پر مشتمل ہے، اور دوم یہ کہ اُن کا تعلق بھی پس ماندہ طبقات اور کم علم حلقوں سے ہے'' (ص۲۴)۔

کتاب سات ابواب میں منقسم ہے اور ہر باب تین یا تین سے زیادہ فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں قرآن و سنت اور اقوالِ فقہاء کی روشنی میں فریضۂ جہاد کا تعین کیا گیا ہے۔ جناب مؤلف کے نزدیک ''جہاد'' لغوی طور پر ''کسی مقصد کے لیے حتی المقدور کوشش کرنے'' کا نام ہے اور شرعی اصطلاح کے طور پر اعلائے کلمۃ اللہ (غلبۂ دین) کے لیے ہونے والی جدوجہد کو جہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جہاد کا ایک جزو یا شعبہ ''جہاد بالسیف'' یا ''قتال'' ہے۔

''اعلائے کلمۃ اللہ یا غلبۂ دین'' کا ''معنی یہ ہے کہ جو لوگ آخری آسمانی دین کی حقانیت کو تسلیم کر کے اس کے مطابق اپنی طرزِ زندگی استوار کر چکے ہیں، اب وہ اللہ تعالیٰ کی ساری زمین پر اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے آنے والے اس نظام (دین) کو نافذ کرنے کی حتی المقدور کوشش کریں، خواہ یہ کوشش زبان (دعوت و تبلیغ) سے ہو، مال سے ہو یا جان (قوت و طاقت) سے'' (ص ٦٦)۔

حافظ صاحب نے واضح کیا ہے کہ ''اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری آسمانی اور تاقیامت ابدی دین ہے اور یہ اللہ کا حق ہے کہ اس کی زمین اور اس کے بندوں پر صرف اسی کا دین اور حکم چلے۔--- آسمانی دین ہی اس بات میں حق بجانب ہے کہ بہرصورت اسے ہی فکری و عملی طور پر نافذ کیا جائے (ص۷۰)۔

اس سلسلے میں، ''اسلامی تصورِ جہاد کے مطابق دشمن کو سب سے پہلے اسلام کی دعوت دی جاتی ہے۔ صدقِ دل سے اس دعوت کو قبول نہ کرنے والوں کو دوسرے نمبر پر جزیہ کی ادائیگی پر مجبور کیا جاتا ہے اور اگر دشمن دوسری صورت کو بھی قبول نہ کرے تو تیسری اور آخری صورت میں اس کے خلاف قتال کیا جاتا ہے'' (ص۷۲)۔

دوسرے باب میں جہاد کی ترغیب اور اس کے فضائل کے ساتھ راہِ جہاد میں شہید ہو جانے والے کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں سیرۃ النبیؐ کی روشنی میں جہادی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھے باب میں جہاد کی بنیادی صورتیں---اقدامی جہاد اور دفاعی جہاد--- اور اُن کے آداب و ضوابط بیان کیے گئے ہیں۔ پانچویں باب میں خلافتِ راشدہ سے لے کر زمانۂ حال تک جہاد کی تاریخ رقم کی گئی ہے۔ چھٹے باب میں دورِ حاضر کی عالمی سیاست اور مسلم قومی ریاستوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ساتویں باب میں عالم اسلام کے دفاع پر گفتگو کی گئی ہے، اور ایک ذیلی مضمون میں جہادی تحریکوں کی خوبیوں اور خامیوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان ابواب میں حافظ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے احساس ہوتا ہے کہ وہ جہاد، اس کی تاریخ اور اس سے متعلقہ مباحث سے بخوبی واقف ہیں۔

کتاب کی ورق گردانی سے واضح ہوتا ہے کہ حافظ مبشر حسین نے گزشتہ بیس پچیس برسوں میں ترغیبِ جہاد کے حوالے سے لکھی گئی تحریروں، اور تصورِ جہاد پر بعض معروف اور اہم کتابوں کا مطالعہ کیا ہے مگر انہوں نے اپنی دو پسندیدہ کتابوں (سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی ''الجہاد فی الاسلام'' اور محمد خیر ہیکل کی ''الجہاد والقتال فی السیاستہ الشرعیہ'') کے تذکرے کے علاوہ کہیں اس لٹریچر کی تفصیل فراہم نہیں کی۔ ضمناً ''ہم جہاد کیوں کر رہے ہیں؟'' (تالیف عبدالسلام بھٹوی)، اور ''امریکہ کے خلاف اسامہ کا اعلانِ جہاد''، نام کے کتابچوں اور سیّد قطب شہید کی کتاب ''معالم فی الطریق'' کے ترجمے ''جادہ و منزل'' کا ذکر کیا گیا ہے، مگر پوری کتاب میں محمد خیر ہیکل یا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی کی مذکورہ کتابوں کا حوالہ کم ہی دکھائی دیتا ہے۔ بحیثیتِ مجموعی ترغیبِ جہاد، فضائل جہاد، غازی اور شہید کے مرتبے، غزواتِ نبوی، عہدِ اسلامی کی فتوحات اور جہادی سرگرمیوں، اور ماضی قریب میں جہادِ افغانستان وغیرہ کے تذکرے کے ساتھ جناب حافظ مبشر حسین نے جہاد کو اقدامی اور دفاعی دو اقسام میں تقسیم کرتے ہوئے یہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے۔

☆ اقدامی جہاد کے لیے اسلامی ریاست کا وجود ضروری ہے۔ حافظ صاحب کے نزدیک ''اسلام پوری دنیا کو صرف دو خطوں [یعنی دارالاسلام اور دارالکفر] میں تقسیم کرتا ہے--- اسلام کے سیاسی پہلو کے اعتبار سے پورے دارالاسلام کا ایک وقت میں ایک ہی مرکزی سربراہ ہو سکتا ہے جسے خلیفہ یا امیر یا اس کے علاوہ کسی بھی مناسب لفظ سے پکارا جا سکتا ہے'' (ص۱۷۸)، اور آج چوں کہ دارالاسلام کا

کوئی ایک سربراہ نہیں، جس کے حکم پر ہی اقدامی جہاد ممکن ہوتا ہے، لہٰذا اقدامی جہاد کی آج کوئی صورت ہی پیدا نہیں ہوتی۔

☆ جان و مال، عزت و آبرو اور ملک و ملت کے تحفظ کے لیے، یا ''کسی خطے میں مسلمانوں پر ظلم و تشدد ہو اور اُن کی آزادی کے تمام حقوق سلب کیے جا رہے ہوں تو اُن کی مدد اورظلم کے خاتمہ کے لیے جہاد کیا جاتا ہے'' (صفحات ۲۴۷-۲۵۴)۔ جو لوگ ظلم و ستم کا شکار ہوں، بلاشبہ اُن کے لیے ''دفاعی جہاد'' درست ہے، مگر یہ سوال جناب حافظ صاحب کی توجہ حاصل نہیں کر سکا کہ آج کی ''قومی ریاستوں'' کی موجودگی میں ایک غیرمسلم ریاست (یا مسلم ریاست ہی) میں اگر مسلمانوں کو حقوق سے محروم کر دیا گیا ہو تو کیا اس ریاست سے باہر کے مسلمان ریاستی سطح پر یا انفرادی سطح پر مظلومین کا ساتھ بشکل قتال دے سکتے ہیں؟ یہی وہ سوال ہے جس نے ذہنوں کو پریشان کر رکھا ہے۔

مطالعۂ کتاب کے دوران میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جناب مصنف نے مختلف ضرورتوں کے تحت اپنی تحریروں کو جوڑ کر مضامین کی شکل دی اور پھر ان مضامین کو کتاب میں یک جا کر دیا ہے۔ ایک ہی تحریر یا اقتباس زمان و مکان کے فرق کے ساتھ مختلف مضامین میں شامل ہو تو پڑھنے والے کو تکرار کا احساس نہیں ہوتا، مگر جب یہ مضامین کتاب کی صورت میں سامنے ہوں تو تکرار کا یہ نقص بہت نمایاں ہو جاتا ہے۔ زیرِنظر کتاب میں دو دو تین تین صفحات کے اقتباسات دو دو بار نقل ہوئے ہیں (مثال کے طور پر دیکھیے: عنوان ''اعلائے کلمۃ اللہ''، صفحات ۶۶-۶۹ اور صفحات ۱۶۹-۱۷۲، عنوان ''عہد شکنی کی سزا''، صفحات ۷۶-۷۸ اور صفحات ۱۷۴-۱۷۶، عنوان ''ابو بصیر کا واقعہ''، صفحات ۲۵۶-۲۵۸ اور صفحات ۲۷۱-۲۷۳)۔

حافظ صاحب نے بعض جدید سیاسی تصورات پر تنقید کی ہے۔ مثال کے طور پر وجود ریاست کے لیے چار عناصر--- علاقہ، آبادی، حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ--- کا تصور اُن کے نزدیک ''خالصتاً جاہلی تصور ہے جس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں'' (ص۱۷۸)۔ اُن کے نزدیک ''اگر کچھ مسلمان منظم ہو کر اپنا ایک امیر منتخب کر لیں اور قصاص و حدود کے اختیارات اسے تفویض کر دیں تو مسلمانوں کی اسلامی ریاست کا یہیں سے آغاز ہو جاتا ہے'' (ص۱۷۹)۔ تاریخ کے کسی سابقہ دور میں تو شاید ایسا ہو سکتا ہو، مگر آج کی باخبر اور باوسائل دُنیا میں کیا کوئی ریاست اپنی جغرافیائی حدود میں کسی تنظیم کا یہ اختیار

برداشت کر سکتی ہے؟ یا ایک ریاست کے قوانین کے برعکس کوئی تنظیم دوسرے قوانین نافذ کرنے کی پوزیشن میں ہوسکتی ہے؟ یا ریاستی قوانین کے نفاذ و اجراء کو اپنے ہاتھ میں لے سکتی ہے؟

کیا آقائے دوجہاں نے ریاست کے لیے علاقے کو ضروری خیال نہیں کیا تھا؟ ریاست کے لیے ''علاقے'' کی ضرورت کے بارے میں جناب حافظ صاحب کا ذہن یکسو نہیں۔ ''علاقے'' کی شرط کو نظرانداز کرنے کے باوجود انہوں نے ''مدنی دور'' ہی کو ''اسلامی ریاست کے قیام'' کا دور بتایا ہے(ص۱۴۶)۔

اسی طرح ''قوم'' اور ''ملت'' کی اصطلاحات پر گفتگو کی گئی ہے اور علامہ اقبال کا حوالہ بھی دیا گیا ہے (صفحات ۳۶۷-۳۷۷)۔ یہ اسی طرح کی لغوی بحث ہے جو مولانا حسین احمد مدنی نے علامہ اقبال کے ساتھ کی تھی۔ جناب حافظ صاحب علامہ اقبال کو صحیح طور پر پیش نہیں کر سکے۔ اُن کے بقول: ''شاعر مشرق--- برصغیر میں متحدہ قومیت کی نفی کرتے ہوئے ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلم قومیت کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں، جبکہ آفاقی سطح پر تمام اہل اسلام کے لیے ملت کی اصطلاح استعمال کرتے'' ہیں(ص۳۷۴)۔ اپنی تائید میں حافظ صاحب نے اقبال کا یہ شعر درج کیا ہے:

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

حالانکہ اس شعر میں ''ملت'' اور ''قوم'' دونوں الفاظ یکساں مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کا مطالعہ پورے تناظر میں نہیں کیا جا سکا۔ علامہ اقبال نے مولانا مدنی کے جواب میں جو مضمون ''جغرافیائی حدود اور مسلمان'' کے زیر عنوان لکھا تھا، اُس کا آغاز اس پیراگراف سے ہوتا ہے:

> میں نے اپنے مصرع ''سرودِ برسر منبر کہ ملت از وطن است'' میں لفظ ''ملت'' قوم کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی میں یہ لفظ اور بالخصوص قرآن مجید میں ''شرع'' اور ''دین'' کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، لیکن حال کی عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں بکثرت سندات موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملت قوم کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ میں نے اپنی تحریروں میں بالعموم ملت بمعنی قوم ہی استعمال کیا ہے۔
> (تصدق حسین تاج، مضامین اقبال، حیدر آباد دکن: احمدیہ پریس، ۱۳۶۲ھ، ص۱۸۰)۔

''دورِ حاضر کی عالمی سیاست اور مسلم قومی ریاستیں'' کے زیرعنوان لکھے گئے باب میں متعدد ایسے

دوسرے مباحث ہیں جن پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ حافظ صاحب کے نزدیک ''افغانستان میں طالبان دورِ حکومت نے خلافتِ راشدہ کی یاد تازہ کر دی تھی'' (ص۳۹۵)۔ اسی طرح ''عالم اسلام پر اقوامِ متحدہ کے مضر اثرات'' کی وضاحت کی گئی ہے۔ اقوامِ متحدہ کے ساتھ مسلم دنیا کے مراسم کی بنیاد بقائے باہمی کا تصور ہے، مگر دنیا کو دارالاسلام اور دارالکفر میں تقسیم کر دینے سے حالتِ جنگ کی کیفیت نظر آتی ہے اور حالتِ جنگ صرف اسی صورت میں نہیں جب دارالاسلام بالادست ہے۔ آج حقائق اس منظر کے بالکل خلاف ہیں۔ علمی و فنی، مادی، مالیاتی، سیاسی اور عسکری طور پر کمزور عالم اسلام الگ تھلگ رہ کر (چہ جائیکہ ٹکراؤ کی کیفیت اختیار کر کے) کیا کوئی معرکہ سر کر سکتا ہے؟ جناب حافظ مبشر حسین اس حوالے سے بہت پُراُمید ہیں۔ اُن کے الفاظ میں ''پستی اور زوال کے باوجود عالم اسلام کے پاس سیاسی اعتبار سے بہت سی ایسی سہولتیں موجود ہیں کہ اگر وہ صحیح معنوں میں حکمتِ عملی کے ساتھ ان سے استفادہ کرے اور قدرتی مواقع بروئے کار لاتے ہوئے پُرخلوص جدوجہد کرے تو پھر سالوں اور مہینوں نہیں، بلکہ دنوں میں عالم اسلام سیاسی سطح پر مغرب کے برابر کھڑا ہو سکتا ہے'' (ص۴۳۳)۔

اگرچہ کتاب کے صفحۂ اوّل پر ناشر نے اسے ''دورِ حاضر میں عمل جہاد کے حوالہ سے غیرجانبدار تجزیہ پر مشتمل ایک مستند کتاب'' قرار دیا ہے، مگر اس میں جہاد کے علاوہ بھی بہت سے مسائل چھیڑے گئے ہیں۔ کتاب کے بالاستیعاب مطالعے کے بعد کوئی باخبر قاری یہ تاثر قائم کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ایک مخلص اور دیندار نوجوان مصنف عالمِ اسلام کو غالب دیکھنے کی خواہش رکھتا ہے اور اپنی نیک تمناؤں کے مطابق مسلم ممالک کی ایک سرگرم مسلم یونین، مسلم عالمی فورس، مسلم عدالتِ انصاف، مسلم مجلس مشاورت کو قائم ہوتے، نیز مسلم دنیا کے درمیان رابطے کی ایک زبان کو کام کرتے دیکھتا ہے، مگر یہ خواہشات کتنی وقیع ہیں، اور کس حد تک سنجیدہ تجزیے پر مبنی اور زمینی حقائق سے ہم آہنگ ہیں؟ اس سلسلے میں مجوزہ ''سرگرم مسلم یونین'' کے بارے میں تجویز پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ لکھا گیا ہے:

> مسلم ممالک فی الحال UNO کی رکنیت برقرار رکھتے ہوئے OIC کی طرز پر اپنی ایک سیاسی تنظیم قائم کریں اور تمام اسلامی ممالک--- خواہ وہ سنی ہوں یا شیعہ، سیکولر ہوں یا جمہوری، کمیونسٹ ہوں یا شاہی--- کو اس یونین میں شامل کریں۔ داخلی طور پر ہر مسلم ریاست اس مسلم یونین کو فعال بنانے کے لیے پورے خلوص کے ساتھ اس کا تعاون کرے اور ہر اہم اور نازک موقع پر مسلم یونین کا متفقہ طور پر ایک ہی فیصلہ ہونا چاہیے تاکہ پچاس سے زائد مسلم ممالک کے اتحاد سے دشمن پر واقعی رعب و خوف طاری

ہو(ص ۳۴۳)۔

سیاسی تجزیے اور خواہش کے اس نمونے کے ساتھ کتاب کے بڑے حصے کے بارے میں کہا جا سکتا ہے:

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا